Fikr-o-Nasar (Islamabad) 2:9 (1965)

عائلی قانون

قدامت پسند اور تجدد پسند طبقے *

کمال فاروقی

عائلی قانون کی اهمیت

یه سوال که مسلمانان پاکستان اسلامی قانون کے مطابق کس طرح اپنی زندگی کی تشکیل کرسکتے هیں، ایک ایسا مسئله هے جو لازماً هر اس مسلم شهری کے لئے بیحد اهمیت رکھتا هے جو واقعتاً اس لقب کا سزاوار هو اور پاکستان کو عملاً ایک اسلامی مملکت بنانے پر مصر هو- اس اهم کام کی انجام دهی میں اسلامی قانون کا اور کوئی شعبه اتنی اهمیت نهیں رکھتا جتنا عائلی قانون کا - لیکن اس سلسله میں ایک مشکل یه آن پڑی هے که بعض اوقات یه فرض کرلیا جاتا هے که عائلی قانون مکمل طور پر نهیں تو کم از کم بڑی حد تک اسلامی معیارات کے مطابق هے اور یه که اس سے زیاده اس میں کسی اور اصلاح و ترمیم کی ضرورت نهیں - یه یاد رکھنا چاهئیے که غیر ملکی حکومت کے عهد میں اسلامی عائلی قانون بھی ان قوانین سے بهت کچھ متاثر هوا جو اس زمانه میں وضع کئے گئے - نیز وه عدالتی فیصلوں سے بھی غیر متاثر نه ره سکا اور یه که اس عهد میں عادات اور رسوم سے متعلقه قوانین کو (بلا لحاظ اس امر کے که وه اسلامی هیں یا غیر اسلامی) بمقابله اسلامی قانون کے (بلا لحاظ اس امر کے که وه مروجه رسوم و عادات کی شکل اختیار کرچکا هے) زیر بحث مسائل میں زیاده اهمیت دی جاتی تھی - مزید برآں اس قانون میں جو رسوم و عادات سے متعلق تھا، بهت کچھ سواد ایسا داخل هوگیا تھا جو یا تو اس

* یه مقاله مصنف کی ایک مستقل کتاب "پاکستان میں اسلامی عائلی قانون" کا ایک باب هے - جو عنقریب شائع هوگی — مدیر

ذیلی بر اعظم کے اس عہد سے تعلق رکھتا تھا جب کہ مسلمانوں نے یہاں قدم ھی نہ رکھا تھا یا جس پر یہاں کے غیر مسلم نظامہائے قانون کے مضر اثرات مرتب ھو چکے تھے۔ چنانچہ اس ذیلی براعظم میں عائلی قانون کے دائرہ میں جو چیز نافذ تھی وہ وھی چیز تھی ، جس کو '' اینگلو محمڈن لا '' کہا جاتا ھے ۔

تاھم بعض اوقات اس رائے کا اظہار کیا جاتا ھے کہ کم از کم عائلی قانون کافی حد تک اسلامی تھا اور یہ کہ اسلامی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قانون کے دیگر شعبوں کو درجہ تقدم عطا کیا جانا چاھئے۔ کیونکہ یہ شعبہ ھائے قانون بالکلیہ غیر ملکی مجالس قانون ساز کے وضع کردہ قوانین یا عدالتی قوانین پر مبنی ھیں۔ یہ ان سوالات کے منجملہ ایک سوال ھے جس کے ساتھ تقدمات کا کوئی ایسا سلسلہ وابستہ کرنا لا حاصل ھے ، جس میں کسی ایک پر غور و فکر کرنے سے دوسرے کو خارج کردینا ضروری ھوجائے ۔ اسلام کو عملاً نافذ کرنے کے مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے نمٹنا ضروری نہ ھو اور اس ضمن میں ھمیں عائلی قانون کی اھمیت پورے طور پر محسوس کرنا چاھئے ۔

زمانہ ما قبل اسلام میں قبیلہ معاشرہ کی بنیادی اکائی تھی۔ اسلام نے جو عظیم الشان معاشرتی تبدیلیاں پیدا کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ قبیلوی وحدت کو امت اسلامیہ کی وحدت میں تبدیل کردیا جو خاندانی زندگی کی وحدت پر مبنی تھی جس کو اب معاشرہ کی اکائی قرار دیا گیا تھا۔ خاندان اور بالخصوص قریبی خاندان اسلامی معاشرے کی بنیاد ھے ۔ یہ بالکل بدیہی امر ھے کہ اگر قریبی خاندان اسلامی معیارات کے مطابق صحت مندانہ طور پر قائم اور فعال ھو ، تو معاشرہ کے نقائص اور عیوب کو دور کرنے میں یہ اولین اور موثر ترین اقدام ھوگا ۔

جہاں ازدواجی تعلقات صحیح معنوں میں اسلامی ھوتے ھیں وھاں بداخلاقی اور عیش پسندی کی بہت سی برائیاں خود بخود دور ھوجاتی ھیں۔ اس سے بھی زیادہ اھم بات یہ ھے کہ ان حالات کے تحت مسلمان بچے ایسی فضا میں پرورش

پاتے ھیں جو ان کے اندر صحیح اقدار ذھن نشین کرنے میں ممد و معاون ھوتی ھے - ان اقدار کو مختصراً سیرت و کردار کے نام سے موسوم کرنا صحیح ھوگا۔ نوجوان نسل کی اس کردار سازی میں تعلیم اور بالخصوص مذھبی تعلیم کا بہت اھم حصہ ھوتا ھے لیکن جب تک ایک صحت مندانہ گھریلو اور خاندانی ماحول کے ذریعہ اس رسمی تعلیم کی تکمیل و استحکام کا کام انجام نہ پائے ' دینی اور دنیوی تعلیم کردار سازی کا مقصد حاصل کرنے میں ناکام رھے گی -

> اس لئے یہ محض ایک امر اتفاقی نہیں کہ قرآن کریم کے سب سے زیادہ تفصیلی ضوابط خاندانی زندگی سے متعلق ھیں کیونکہ خاندانی زندگی ھی وہ اساس ھے، جس پر ناگزیر طور سے کسی حقیقی معاشرتی انقلاب و تبدیلی کی بنیاد رکھی جاسکتی ھے -

اسی طرح یہ امر بھی محض اتفاقی نہیں کہ موجودہ زمانہ میں بیشتر مسلم ممالک نے جن میں پاکستان بھی شامل ھے' خاندانی اور عائلی قوانین کے مسئلہ سے نمٹنے کی کوشش کی ھے - دیگر ممالک میں عائلی قوانین کے سلسلے میں جو ارتقاء عمل میں آیا ھے' اس کے بارے میں آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن یہاں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور زور دینے کے قابل ھے وہ یہ ھے کہ جس اسلامی انقلاب کے حصول کے ھم سب خواھشمند ھیں اس کے لئے پہلے اس امر کی تحقیق کرنی ضروری ھوگی کہ ھمارے خاندانی ادارے اسلامی احکام سے کس حد تک مطابقت رکھتے ھیں -

اختلافات آراء

اس تحقیق میں یہ بات بآسانی نظر آسکتی ھے کہ موضوع زیر بحث پر اختلافات موجود ھیں - نکاح اور عائلی قوانین کی کمیشن کی رپورٹ نیز پاکستان کے عائلی قوانین کے آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۱ء کے سلسلہ میں یہ اختلافات پورے طور سے منظر عام پر آگئے ھیں - مجوزہ تبدیلیوں کے ضمن میں چار نقاط نظر پائے جاتے ھیں - یہ کہ مجلس قانون ساز کا وضع کردہ یہ قانون بالکلیہ منسوخ کردیا جائے - یہ کہ قانون زیر بحث اپنی موجودہ صورت میں قائم رکھا جائے- یہ کہ قانون میں اس طور پر ترمیم کی جائے کہ یہ سابقہ حالت سے قریب تر

ہوجائے - اور آخری رائے یہ ہے کہ اس قانون میں ایسی ترمیم عمل میں لائی جائے، جس سے سابقہ حالت بالکل بدل جائے اور عائلی زندگی کی ایک نئی تشکیل عمل میں آئے - پہلی اور دوسری رائے کو قدامت پسندانہ نقطہ نظر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - تیسری اور چوتھی رائے کو تجدد پسندانہ قرار دیا جاسکتا ہے مگر ایک پانچواں نقطہ نظر بھی پایا جاتا ہے جو نسبتاً ذیلی اہمیت رکھتا ہے اور جس کا موقف یہ ہے کہ تمام قوانین کو لادینی (سیکولر) اساس پر لانا ضروری ہے - اس طرح کہ ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو - بلکہ ان کا اطلاق تمام شہریوں پر یکساں طور سے کیا جاسکے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم -

لا دینی مسلک کے قلیل التعداد حامیوں سے قطع نظر کرکے اور دو بڑے اہم نقاط نظر کے حامی اشخاص کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ تقسیم پورے طور پر صحیح نہیں ہے - کیونکہ ہر نقطہ نظر کے حامیوں کے مابین بعض فروعی اختلافات بھی پائے جاتے ہیں - قدامت پسندوں اور تجدد پسندوں کی اصطلاحات گمراہ کن ہوسکتی ہیں - قدامت پسند چاہتے ہیں کہ قدیم اقدار و معیارات کو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رکھا جائے لیکن ان کے مخالفین یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ وہ ان اقدار و معیارات کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں یہ نہیں دیکھتے کہ یہ اقدار و معیارات کس حد تک اسلامی ہیں اور کہاں تک غیر اسلامی- تجدد پسند چاہتے ہیں کہ جدید انداز فکر و نظر اختیار کیا جائے لیکن وہ یہ کہیں گے کہ ان پر یہ الزام عائد کرنا قطعاً غلط ہے اور یہ کہ اس کے بالکل برعکس چونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ اسلام ایک ابدی مذہب ہے اس لئے وہ عہد جدید کے مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے حل کرنا چاہتے ہیں - دوسرے گروہ کو بعض وقت لبرل (وسیع النظر اشخاص) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اس سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم انہیں ''تقلیدیہ'' اور ''اجتہادیہ'' کے القاب سے موسوم کریں - ''تقلیدیہ'' گروہ کا اعتقاد یہ ہے کہ اسلام کو جیسا کچھ اسلاف نے سمجھا تھا اور اس کی جو تعبیر و تشریح چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں کی جاچکی ہے، وہ ابدالآباد تک صحیح رہے گی اور ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ ہم اسلاف کی تقلید کرتے رہیں اور وہ بھی بے چون و چرا - جبکہ دوسری جانب ''اجتہادیہ'' دور وسطي

کے فقہی شاهکاروں کی اور اسلاف نے اسلام کی جو تعبیرات اور تشریحات اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کی هیں، ان کی صحت کو تسلیم کرتے ہوتے یہ استدلال کرتے هیں کہ مسلمانوں پر یہ ایک دائمی فریضہ عائد کیا گیا هے کہ وہ شریعت کا ایسا فہم حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف رهیں جس کا اطلاق ان کے مخصوص زمان و مکان کے حقیقی حالات پر عمل میں لایا جا سکے -

معدودے چند گروهوں کو چھوڑکر پاکستان میں یہ اختلافات مختلف پارٹیوں کے اختلافات سے ما فوق هیں- نیز ان اختلافات سے بھی مافوق هیں، جو سیاسی اقتدار رکھنے والے گروهوں یا ان کے حامیوں اور ارباب اقتدار کے مخالفین کے مابین پائے جاتے هیں - دونوں جانب ایسے لوگ پائے جاتے هیں، جنھیں قدامت پسند (یا تقلیدیہ) اور تجدد پسند (یا اجتہادیہ) کہا جاسکتا هے - یہ ایک نہایت اهم امر هے اور وہ لوگ جو کسی وقتی سیاسی مقابلہ یا نزاع کی حالت میں قدامت پسندوں اور تجدد پسندوں کے اختلافات کو هوا دینا چاهتے هیں، جبکہ ان اختلافات کی شناخت ناممکن نہیں تو دشوار ضرور هے ، پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ملک بنانے میں ایک غلط اقدام کے مجرم قرار پاتے هیں اور اس مقصد کے حصول میں دشواریاں اور انتشار پیدا کرنے کے ذمہ دار هیں - اس غیر ضروری انتشار کے باعث پاکستان کے هر شہری کے لئے یہ امر بیحد ضروری هوجاتا هے کہ وہ ان آرا کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لئے جو ایسے مسائل پر ظاهر کی جائیں، اعلیٰ درجہ کی بصیرت سے کام لے - بعض اوقات ایسا هوتا هے کہ کسی اسلامی مسئلہ پر کسی خاص رائے کا اظہار یا ظاهر کردہ آرا کی مخالفت صواب و ناصواب کی بنا پر حقیقت سے بالکل معرا هوتی هے اور ایسی تائیدی یا مخالفانہ آرا کے کئی ایک محرکات هوسکتے هیں- مثلاً اقتدار کی خاطر اقتدار حاصل کرنے کی خواهش اور اس لئے بلا امتیاز اهل اقتدار کی حکمت عملی کو نیچا دکھانے کی کوشش یا اسلام کی تعبیر و تشریح کی اجارہ داری کے ادعا کو چیلنج کرنے پر ناراضگی جب کہ اس اجارہ داری کے باعث اس گروہ کو جو اس کے حصول کے لئے کوشاں هو، معاشرے میں ایک خاص مقام اور وقار حاصل کرنے کی توقع هو- یا کسی ایسی جماعت کے برسر

اقتدار آنے کا خطرہ جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ وہ ایک آمرانہ یا فاشسطی نظام قائم کرے گی یا مذہبی طبقات کی مخالفت یا اسلامی اقدار و معیارات کا تحقق کرنے کی کوشش میں غور و فکر اور تدبیر و تفحص کے اندر وقتی جذبات اور خواهشات نفس کی در اندازی یا اهل اقتدار کی مکمل تائید و حمایت تا کہ وہ مسند اقتدار پر آئندہ بھی فائز رہ سکیں -

قدامت پسندوں اور تجدد پسندوں کے مابین جو حقیقی اختلافات پائے جاتے ھیں ان کو سمجھنے یا سمجھنے کی کوشش کرنے میں اس قسم کے محرکات کی کی کوئی قدر و قیمت نہیں - اسی طرح بعض گروھوں کا یہ دعوی کہ وهی راسخ العقیدہ ھیں اور یہ کہ وہ مخالف گروھوں کے عقائد میں ضلالت و گمراھی یا کفر و الحاد کے عناصر کی نشان دھی کرسکتے ھیں ایک ایسا دعوی ھے جسے کوئی سنجیدہ آدمی در خور اعتنا نہیں قرار دے سکتا ھے - قدامت پسند اور تجدد پسند دونوں یہ دعوی کرسکتے ھیں کہ وہ ایک دوسرے کے نسبت زیادہ راسخ العقیدہ ھیں جس سے ان کی مراد یہ ھوگی کہ اسلام کے بارے میں ان کا فہم صداقت سے قریب تر ھے - ان اختلافات کا جائزہ لینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو ذھن نشین رکھنا زیادہ فائدہ مند ھوگا کہ امت مسلمہ کے باھمی اختلاف باعث رحمت ھیں (اختلاف امتی رحمة) -

> قدامت پسندوں اور تجدد پسندوں کے اختلافات کسی ایک مقام یا عہد سے مخصوص نہیں - یہ سمجھنا غلط ھوگا کہ صرف یہ گذشتہ دس پندرہ سال میں معرض وجود میں آئے یا صرف پاکستان کی حد تک محدود ھیں - یہ اختلافات ھر زمانہ اور ھر ملک میں موجود تھے -

زمانی نقطہ نظر سے اختلافات کا جائزہ

اگر زمانی حیثیت سے ان اختلافات کا جائزہ لیا جائے اور ھم ذیلی براعظم ھند کی گذشتہ صد سالہ تاریخ تک اپنے آپ کو محدود رکھیں تو ھم یہ محسوس کریں گے کہ بعض افراد ان اختلافات کی نمائندگی کرتے ھیں - سر سید احمد خاں ۱۸۵۷ء کے بعد زمانہ کے ایک بڑے تجدد پسند تھے - ۱۸۶۰ء کے قریب

کے زمانہ میں جو حالات پائے جاتے تھے انھیں اس وقت سمجھنا دشوار ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو انگریزوں نے بالکل کچل دیا تھا اور مغلیہ سلطنت کے نظم و نسق چلانے والوں کے آخری بچے کھچے افراد کا چراغ حیات گل کیا جارہا تھا، اس زمانہ کے بعض اہل فکر مسلمانوں پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ ذیلی بر اعظم ہند میں مسلمانوں کے لئے ایک مرفہ الحال زندگی کی تعمیر کا کوئی امکان نہ تھا بلکہ یہ مسئلہ بھی ایک نازک دور میں داخل ہوگیا تھا کہ ان کی بقا کے حصول کا کیا ذریعہ اختیار کیا جائے۔ سر سید احمد خان اس نتیجہ پر پہنچے کہ جدید تمدن اور نئی دنیا کا علم جو ہر طرف سے انسانیت پر روز بروز محیط ہوتا جارہا تھا، مسلمانوں کے لئے از بس ضروری ہوگیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس چیز کو غلط طور پر ''مغربی علم و فن'' کہا جاتا ہے، مسلمانوں کے لئے اس کا حصول ایک عین اسلامی فعل ہے اور اس طرح غیر مسلموں کی زبانیں جاننا بھی مسلمانوں کے لئے جائز اور ضروری ہے۔ سر سید احمد خان کے نظریہ کی رو سے اسلام نے حصول علم کی (خواہ اس کا ماخذ کوئی سا بھی ہو) نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ مسلمانوں کو حصول علم کا حکم بھی دیا ہے۔ اور جن حالات سے مسلمان گذر رہے تھے، ان کے تحت مسلمانوں کے لئے نہ صرف مناسب بلکہ ضروری تھا کہ وہ جدید علوم و فنون کی تحصیل کریں کیونکہ اس کے بغیر وہ ان خطرات سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تھے۔ ان تجدد پسندانہ نظریات کے باعث اس زمانہ کے سارے قدامت پسند طبقے سر سید کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے۔ تاہم جیسا جیسا وقت گذرتا گیا سر سید کی تجدد پسندی کا اثر غالب ہوتا گیا یہاں تک کہ علیگڑھ میں ایک جدید طرز کی یونیورسٹی قائم ہوگئی جس نے مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا جن کے احساسات اسلامی تھے مگر اس کے ساتھ وہ عہد جدید اور اس کے تقاضوں سے بھی پوری طور پر روشناس تھے۔

زمانہ ما بعد کے مسلمان سر سید کی خدمات کے کس حد تک مرہون منت ہیں، اس کا احساس عام طور پر معدوم ہے۔ جب پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا اور مملکت پاکستان وجود میں آئی تو اس کی بقا کے لئے یہ ضروری تھا کہ نظم و نسق کے ماہرین۔ فوجیوں۔ ڈاکٹروں۔ معلموں۔ ماہرین معاشیات۔

ماہرین سیاست ـ سائنسدانوں اور ماہرین صنعت کی ایک کافی تعداد جدید حالات میں اس مملکت کو چلا سکے ـ اس کی نمائندگی کرسکے اور بیرونی ممالک میں مختلف امور کے بارے میں اس کی جانب سے گفت و شنید کرسکے ـ نیز اس امر کا یقین حاصل کرسکے کہ اپنے داخلی ارتقا میں یہ مملکت بقائے حیات کی جدوجہد سے عہدہ برآ ہوسکے گی ـ جن لوگوں نے اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ علیگڑھ کی فضا کے پیدا کردہ تھے اور ان کے بغیر ان نتائج کا تصور کرنا دشوار نہیں جن سے پاکستان کو دوچار ہونا پڑتا ـ سر سید احمد خان کی تجدد پسندی سے جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس حقیقت کو ملحوظ رکھاجائے کہ خود قدامت پسند طبقات اپنے دینی مدارس کے نصابات پر روز افزوں نظر ثانی کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ان اصلاحات سے قریب تر ہوجائیں جو کسی زمانہ میں سر سید نے تجویز کی تھیں نیز ان مدارس میں اب روز بروز انہیں مضامین کو داخل کیا جا رہا ہے جن کی مخالفت میں کسی وقت تمام قدامت پسند طبقات سر سید کے خلاف صف آرا ہوگئے تھے ـ

کچھ زمانہ بعد قدامت پسند طبقوں نے اقبال کے بالمقابل وہی طرز عمل اختیار کیا، جو وہ سر سید کے بارے میں پہلے اختیار کرچکے تھے یعنی انہوں نے اقبال کو اپنی تنقید و تعریض کا ہدف بنایا ـ اگرچہ قدامت پسند اور تجدد پسند دونوں اپنی اپنی جگہ اقبال کو اپنے زمرہ میں شامل کرنا چاہتے ہیں ـ قدامت پسند طبقہ جس استدلال کی بنا پر اقبال کو اپناتا ہے وہ یہ ہے کہ اقبال نے قوم کو ایک مقام پر متنبہ کیا ہے کہ تنگ نظر اور کم فہم متجددین کے اجتہاد کو تسلیم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اسلاف کی قدم بقدم پیروی کی جائے ـ دوسری طرف تجدد پسند طبقہ اقبال کی ان تحریروں سے استدلال کرتا ہے جن کی رو سے آج کے عہد میں اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو Reconstruction of religious thought in Islam شائع شدہ لاہور کے ایڈیشن سنہ ۱۹۵۱ء کے صفحات ۱۴۳ تا ۱۴۹) جس میں اقبال نے اجتہاد کے مطلق انکار کو بالخصوص زمانہ جدید میں ایک انتہائی تعجب خیز امر قرار دیا ہے اور جہاں انہوں نے یہ دعوی کیا ہے کہ اس طرز فکر کے باعث اسلامی فقہ پر کامل

جمود طاری ہوگیا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں میں جو بظاہر متضاد نظر آتی ہیں، ایک داخلی تطابق پایا جاتا ہے جس کو صرف وہ لوگ محسوس نہیں کرسکتے جن کے خیال میں اقبال کی فکر تناقضات سے پاک نہیں تھی۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اقبال ایسے اجتہاد پر تقلید کو ترجیح دیتا ہے جو تنگ نظری اور کم فہمی پر مبنی ہو لیکن وہ ایسے اجتہاد کو تقلید سے بہتر خیال کرتا ہے بلکہ امت کے لئے اسے ضروری سمجھتا ہے جس کی پشت پر اصابت فکر کی طاقت موجود ہو۔ بحیثیت مجموعی تقلید اور اجتہاد کی بحث و نزاع میں اقبال کا موقف وہی ہے جو ''اجتہادیہ'' یعنی تجدد پسندوں کا ہے۔

قدامت پسند اور تجدد پسندوں کے مابین جو اختلافات پائے جاتے تھے، وہ قیام پاکستان کے مسئلہ میں پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آگئے۔ قدامت پسندوں کا ایک ممتاز طبقہ جس کے سرگروہ بعض علماء تھے پاکستان کے تصور کا مخالف تھا۔ اس بناء پر اس نے قائد اعظم محمد علی جناح جیسے تجدد پسند کی پیروی کرنے سے مسلمانوں کو منع کیا۔ قائد اعظم کی تجدد پسندی کو تحریک پاکستان کے خلاف ایک استدلال کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کے باوجود عامۃ المسلمین نے قدامت پسندوں کے مشورہ کو رد کردیا اور قائد اعظم کی رہنمائی تسلیم کی۔

پاکستان بننے کے بعد تجدد پسندوں کا نقطہ نظر سیاسی معاشرتی اوردوسری حیثیتوں سے فروغ پاتا رہا۔ اب اس بات کو عام طور پر تسلیم کیا جاچکا ہے کہ عورتوں کو نہ صرف حق رائے حاصل ہے بلکہ وہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔ تحصیل علم کی کوشش خواہ یہ علم دنیا کے کسی ملک یا خطہ سے حاصل کیا جاسکتا ہو برابر جاری ہے۔ اور پاکستان اقوام عالم کی برادری میں نیز اس کی بیشتر سرگرمیوں میں فاعلانہ حیثیت سے شریک ہے۔ اس امر کی تحقیق کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ قدامت پسند علماء کے کتنے بچے جدید تعلیم کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔

علاقائی ۔ ملکی اور خطہ واری اختلافات

اگر قدامت پسندوں اور تجدد پسندوں کے اس اختلاف پر مکانی نقطہ نظر سے غور کیا جائے یعنی سارے عالم اسلامی میں ان اختلافات کی کیا نوعیت

رهی ہے تو معلوم ہوگا کہ عملاً ہر ملک اور ہر خطہ میں تجدد پسندی کی جانب رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ ترکی میں ۱۹۲۳ء کے بعد قدامت پسندی کے خلاف ایک انتہا پسندانہ رد عمل ہوا مگر اب اس امر کے علامات اور شواہد پائے جاتے ہیں کہ یہ انتہا پسندی اسلامی فکر کے چوکھٹے میں تجدد پسندی کی طرف راجع ہوتی جارہی ہے۔ بہر حال ترکی میں انقلاب آیا۔ اس کے بارے میں عام طور پر یہ ایک غلط خیال قائم ہوگیا ہے کہ قدامت پسندی کی مخالفت صرف کمال اتاترک کا ذاتی فعل تھا اور یہ کہ اتاترک سے پہلے جب عثمانی سلاطین حکمران تھے۔ ترکی میں اسلام کی خالصتاً قدامت پسندانہ تعبیر و تشریح کی فرمانروائی تھی۔ یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ اسلامی قانون فقہ کی اس تعبیر و تشریح میں جو دور وسطی میں مسلم ہوچکی تھی، تبدیلی و نشو و نما کا عمل اتاترک سے بہت پہلے خود عثمانی سلاطین کے تحت شروع ہوچکا تھا اور اس تبدیلی کے عمل کا مقصد یہ تھا کہ اس چیلنج کا مقابلہ کیا جاسکے جو چہار دانگ عالم سے در پیش تھا۔ قانون و فقہ کے دائرہ میں اصلاحی تحریک کا آغاز سلطان محمود ثانی (۱۸۲۸ تا ۱۸۳۹) کے زمانہ میں ہوا اور اس کے بعد سلطان محمود کے جانشین عبدالمجید ثانی (۱۸۳۹ تا ۱۸۶۱) نے تنظیمات کے عنوان سے جو قوانین نافذ کئے وہ اپنی نوعیت میں تجدد پسندانہ اور تقلید جامد کے خلاف تھے۔ مثلاً ۱۸۵۰ء کے تجارتی‌ضوابط مجلہ یا عثمانی سلطنت کا سول ضابطہ جو ۱۸۷۷ء میں نافذ ہوا وہ تقلیدی رجحانات کے خلاف ایک مزید اقدام تھا کیونکہ اس کی رو سے شہادت اور وجوبات کے قوانین میں ترمیم کی گئی تھی۔ اور آخر میں ۱۹۱۷ء کا عائلی حقوق کا عثمانی قانون نافذ ہوا، جس پر سلطنت عثمانی کے اختلال کے بعد شام، لبنان، فلسطین اور اس‌زمانہ کی ماورائے اردن سلطنت میں عمل ہوتا رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ ترکی میں تجدد پسندی کا ارتقا اس زمانہ میں بھی جبکہ عثمانی سلاطین کی حکومت قائم تھی اور استنبول سلطنت عثمانیہ کا دارالخلافہ تھا اپنی نوعیت میں بہت دور رس تھا اور مصطفیٰ کمال کی لادینیت سے پہلے ترک نوجوانوں نے جو تحریک چلائی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجدد پسندی کے حق میں اور قدامت پسندی کے خلاف ترکوں کا تاریخی میلان کتنا گہرا اور دور رس تھا۔

دیگر ممالک اسلامیہ میں قدامت پسندی کی مخالفانہ تحریکات اور تجدد پسندی کی تاریخ کاجائزہ لئے بغیر ہمارےمقصد کے لئے یہ کافی ہوگا کہ اسلامی قانون کے دائرہ میں جو ترقیاں عمل میں آئی ہیں، ہم ان کی چند مثالیں بغیر کسی خاص ترتیب کا لحاظ کئے ہوئے پیش کردیں ۔ لبنان میں ۱۹۳۲ء میں شام میں ۱۹۴۹ء اور عراق میں ۱۹۵۳ء میں ایک نیا ضابطہ دیوانی وجود میں آیا ۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ ۲۵،۱۹۲۹ء کے ایکٹ ۲۵ اور ۱۹۳۱ء کے ایکٹ ۷۱ کی رو سے مصر میں عائلی قانون کو اسلامی تجدد پسندی کےتحت تبدیل کیا گیا ۔ شخصی حیثیت کے بارے میں ایک مزید ضابطہ کا مسودہ اسی ملک میں ۱۹۶۲ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا ۔ شام میں ۱۹۵۳ء میں، تیونس میں ۱۹۵۶ء میں اورعراق میں ۱۹۵۹ء میں ایک نئے ضابطہ کے ذریعہ تعدد ازواج پر پابندی عائد کی گئی ۔ اسی طرح مصر میں ایکٹ ۷۷ مجریہ ۱۹۴۳ء اور ایکٹ ۷۱ مجریہ ۱۹۴۶ء کی رو سے نیز تیونس میں ۱۹۵۹ء میں قوانین وراثت پر عہد جدید کے تقاضوں کی روشنی میں نظرثانی کی گئی ۔ اس طرح وقف کے قانون میں بھی مصر میں ۱۹۴۶ء میں لبنان میں ۱۹۴۷ء میں اور تیونس میں ۱۹۵۹ء میں تبدیلیاں عمل میں آئیں ۔ اسی قسم کی تبدیلیاں مراکش میں بالخصوص ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں مدونہ کی رو میں وقوع پذیر ہوئیں اور ایران میں ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان جو قوانین وضع کئے گئے ان کا بھی یہی اثر ہوا ۔

سعودی عرب اور افغانستان جیسے ممالک بھی عہد جدید کے تقاضوں اور تجدد پسندانہ میلانات سے محفوظ نہ رہ سکے ۔ مثلاً گذشتہ سال عرب میں غلامی کو ناجائز قرار دیا گیا اور افغانستان سے پردہ اور نقاب پوشی کا رواج تیزی سے متروک ہوتا جارہا ہے ۔ مثلاً افغانستان کی ملکہ شاہ افغانستان کے ساتھ برقعے اور نقاب کے بغیر پبلک جلسوں میں شریک ہوتی ہیں ۔ اس طرح اسلامی تجدد پسندی اسلامی ممالک کے دور دراز خطوں میں بھی ایک بڑھتی ہوئی طاقت ہے ۔

پہلے مرحلہ میں عام میلان یہ رہا ہے کہ تجدد پسند طبقہ کسی اصلاح کی تجویز کرتا ہے اور قدامت پسند طبقہ اس کو کفر و ضلالت سے متہم کرتا ہے ۔ دوسرے مرحلہ میں تجدد پسند طبقہ قدامت پسندوں کی مخالفت کے باوجود

اپنی اصلاحی تجاویز کو عملی جامہ پہناتا ہے ۔ تیسرے مرحلہ میں قدامت پسند طبقات ان اصلاحات کو خاموشی کے ساتھ اور بغیر کسی رد و قدح کے تسلیم کرلیتے ہیں، آخرکار چوتھے مرحلے میں خود قدامت پسند طبقات دعوے کرتے ہیں کہ نافذ کردہ اصلاحات کو انہوں نے اسلام کے منافی قرار نہیں دیا تھا بلکہ وہ ان اصلاحات کو سود مند سمجھتے ہیں ۔

پاکستان میں اس بارے میں جو تصوراتی ارتقا عمل میں آیا ہے اسے خود پاکستان کے ماضی کے پس منظر نیز ان تصوراتی اور عملی ترقیوں کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے جو انہیں خطوط پر دیگر ممالک میں عمل میں آئی ہیں ۔ یہ ترقیاں صاف طور سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس طول طویل بحث میں اجتہاد ضروری ہے کہ آیا اس زمانہ میں تقلید اسلام کے مقتضیات کے مطابق ہے یا اجتہاد ۔ غالب رجحان یہ رہا ہے کہ خواہ اسلام کی موجودہ تعبیرات دور وسطی کی تعبیرات سے کتنی ہی مختلف ہوں لیکن اس امر کو متعین کرنے میں کہ ان واقعی حالات کے تحت جن سے مسلمان اس وقت گذر رہے ہیں، اسلامی احکام کی نوعیت کیا ہے اور ان کا اطلاق ہماری عملی زندگی پر کیوں کر کیا جاسکتا ہے اجتہادی کوشش ضروری ہے ۔ (حوالوں کی سہولت کے لئے دیگر مسلم ممالک میں عہد جدید کے تقاضوں کے مطابق قوانین میں جو ارتقا عمل میں آیا ہے، اس کی ایک جدول آخر میں درج کی گئی ہے) ۔

اسلامی تجدد پسندی کی نظریاتی اساس

سطحی نقطہ نظر سے دیکھاجائے تو یہ صحیح ہے کہ اسلاف اور ان کی ایسی تعبیرات و تشریحات کا احترام کرنے میں جو انہوں نے اسلامی فقہ اور قانون کے بارے میں اپنے زمانہ کے مطابق پیش کیں نیز ان کی تقلید کرنے میں ایک بڑی دلکشی پائی جاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ مذہبی تقدس کا جذبہ بھی وابستہ ہے ۔ لیکن احترام اور تقدیس میں بڑا فرق ہے کیونکہ تقدیس پرستش اور عبادت کے جذبہ سے بہت قریب ہے ۔ پاکستان کا اسلامی تجدد پسند طبقہ اس قسم کے تقلیدی نظریہ میں جو بڑا نقص محسوس کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلاف نے شریعت کی جو تعبیرات کی تھیں، ان کے متعلق یہ تصور

کرنا کہ نہ صرف وہ خطا و لغزش سے بری بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صحیح ہیں - اسلاف کی عقلی اور مذہبی بصیرت کی ایسی پرستش کرنے کے مترادف ہے جس کے خطرات سے قرآن نے مسلمانوں کو مسلسل آگاہ اور متنبہ کیا ہے - اوائل اسلام اور دور وسطی کے فقہا اور علما کا احترام کرنے اور ان کی پرستش کرنے میں جو فرق ہے، اس کے جانچنے کا فیصلہ کن طریقہ یہ ہے کہ آیا کسی شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک مخصوص صورت حال میں احکام الٰہی کی فہم پیدا کرنے کے لئے مسلسل اجتہاد کی ضرورت ہے یا کسی شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ ماضی کی تعبیرات سے وابستہ رہنا ضروری ہے اور صرف ان کی تقلید ہی کافی ہے -

اسلامی احکام کی تعبیرات و تشریحات کے بارے میں ان مختلف نقاط نظر سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ شریعت اسلامی ایک ہے لیکن فقہ میں اس کی تعبیرات مختلف ہیں - یہی وجہ ہے کہ مختلف فقہی مذاہب وجود میں آئے اور ہمارے اسلاف کے مسلک کی رو سے یہ تمام مذاہب فقہ اپنی جگہ درست اور باعتبار عقیدہ صحیح ہیں - مزید برآں فقہی قواعد و قوانین شریعت کے مقرر کردہ معیارات کے عملی اطلاق کا ایک ذریعہ ہیں - اس لئے ان میں مختلف علاقوں کے مخصوص ماحول کا لحاظ کیا گیا ہے (مثلاً حجاز اور کوفہ کے ماحول میں جو فرق تھا اس کا اثر حجازی اور عراقی فقہ پر مترتب ہوا) -

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ان مسائل پر اختلاف رائے پایا جاتا رہا ہے اور آئندہ بھی اختلاف رہے گا - بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس امر کے باوجود کہ مسلمانوں کی شریعت ایک ہے لیکن اس کے مختلف فقہی مذاہب ہیں - اور اس کی تعبیرات مختلف ہیں- شریعت اور فقہ کے مابین اصلاً کوئی فرق نہیں اور اوائل اسلام کے مختلف مکاتیب فکر کے اختلافات کو ذیلی اور فروعی قرار دیکر ان کی اہمیت کو اصل قرار دینے سے یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ ان اختلافات کا وجود ہی اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ شریعت اور فقہ میں صرف درجات ہی کا نہیں بلکہ ایک نوعی فرق بھی موجود ہے -

اس امر کا امکان ہے کہ تقلید اور اجتہاد دونوں کی حمایت کرنے والے گروہ موجود رہیں گے اور ان گروہوں میں بھی تقلید اور اجتہاد کی نوعیت کے

بارے میں اختلافات پائے جائیں گے - بعض حضرات تقلید کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ تخئیر کے بھی قائل ہیں، یعنی وہ اپنا یہ حق محفوظ رکھتے ہیں کہ مختلف فقہا کے فیصلوں میں سے ان کو جو فیصلہ قرین صواب معلوم ہو، اس کو اختیار کرلیں - کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس امر کی کوشش کریں گے کہ مختلف فقہی مذاہب کے پسندیدہ اجزا کو لیکر انہیں ایک مرتب نظام کی شکل عطا کریں اور کسی دوسرے فقیہ کی جس کے وہ پیرو نہیں ہیں کسی ایسی رائے کو قبول کرلیں جس کی تائید اس مذہب کے ماننے والوں کی بہت کم تعداد نے کی ہے - یا ماضی کے کسی ایک فقیہ کی منفرد رائے کو مان لیں جو اپنے زمانہ میں غیر معروف تھا اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مقلد قرار دیں- دوسری طرف ایسے لوگ بھی پائے جاسکتے ہیں جو اجتہاد کی ضرورت کو تسلیم کریں گے لیکن ایک محدود دائرے میں اور پھر اس محدودیت کے بھی مختلف مدارج ہوسکتے ہیں -

اس امر کا انتظار کرنا کہ یہ تمام اختلافات رفع ہوجائیں تب آگے کی طرف کوئی قدم بڑھایا جائے قریب قریب ناممکن ہے - واقعات عالم جس رفتار سے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں وہ برابر اسی طرح بڑھتے رہیں گے خواہ اجتماعی حیثیت سے ان مسائل کی بابت ہم کوئی تصفیہ کرسکیں یا نہ کرسکیں نہ ہم اس امر کو نظر انداز کرسکتے ہیں کہ موجودہ عہد میں مسلمانان عالم مختلف ممالک اور ریاستوں میں منقسم ہوگئے ہیں - اس اثناء میں ترقیاں بھی ہوتی رہیں گی اور اجتہاد کا سلسلہ بھی جاری رہے گا -

اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے کی اس جدوجہد میں اہلیت کا سوال بھی ہمارے سامنے آتا ہے اور قدامت پسند طبقات بھی تقلید محض کے قدیم اور غیر مصالحانہ نظریہ کو موجودہ حالات پر منطبق کرنے کی کوشش سے روز بروز دستبردار ہوتے جاتے ہیں - اس کے برعکس بہت سے لوگ جن کا تعلق قدامت پسند طبقات سے ہے اس سے انکار نہیں کرتے کہ اجتہاد کے حق کا استعمال کیا جاسکتا ہے بلکہ وہ تجدد پسند طبقہ کی اہلیت اجتہاد کے منکر ہیں- وہ اس اہلیت کو اس بنا پر اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتے ہیں کہ صرف قدامت پسند

طبقات ہی قدماء کی تصانیف قرآن و سنت کے صحیح علم سے بہرہ ور ہیں ۔ لیکن تجدد پسندوں کے نقطہ نظر سے اہلیت کا مفہوم کچھ اور ہے یعنی عہد جدید کے حالات اور تقاضوں کو قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھنے اور ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی اہلیت ۔ پھر یہ امر بھی فوری طور پر واضح نہیں کہ ان مختلف الخیال طبقات کے مابین اتفاق رائے کی آخری بنیاد کیا ہوگی ۔

اگر گذشتہ تجربات اس سلسلہ میں ہماری کوئی رہنمائی کرسکتے ہیں تو سر سید احمد خان کی اہلیت ان کے حریفوں اور مخالفین کے بالمقابل آج نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ کے بعد زیادہ واضح ہے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علماء کی اس کثیر جماعت کے بالمقابل جو انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دے رہی تھی، ذیلی براعظم ہند کے مسلمانوں کی قیادت کے معاملہ میں بانی پاکستان کی اہلیت اب بہت واضح ہے اور ماضی کے واقعات پر غور کرنے سے اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے ۔ اگر ذیلی براعظم ہند کے مسلمانوں نے سر سید احمد خان کی یا بانی پاکستان کی تجدد پسندی کے بالمقابل قدامت پسندوں کا مشورہ مان لیا ہوتا تو نہ علی گڑھ ہوتا اور نہ ہی پاکستان وجود میں آتا ۔ اہلیت اجتہاد کے جو شرائط گذشتہ چند سالوں میں قدامت پسند طبقات نے متعین کئے ہیں ان میں اور ان صفات کے مابین جو مسلمان قوم نے اہلیت کے تعلق سے واقعتاً تسلیم کئے، ایک بڑا فرق ہے ۔ اہلیت کے صفات اور شرائط کے مسئلہ پر روز بروز یہ رجحان ترقی پارہا ہے کہ اس کے تصفیہ کے لئے امت کی طرف رجوع کیا جائے اور مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے تجدد پسند طبقات جمہوریت کے قیام کے خواہش مند ہیں لیکن قدامت پسند طبقات جمہوریت کے قیام کو اشتباہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ دور وسطی کی تعبیرات کے ماہر ہیں جن کی رو سے شاہی نظام کو تسلیم کیا گیا تھا ۔